تحریر: سید عبدالرحمٰن ایم۔اے لیکچرر تاریخ
کراچی یونیورسٹی

ترجمہ: محمد معین خان۔ بی۔اے
(انگریزی سے اردو ترجمہ)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے

عمرانیاتی معاشی افکار

اور ان کی تحدیث

سترھویں صدی کے اختتام اور اٹھارویں صدی کے آغاز پر مسلم معاشرہ کا جو حال تھا اس کی بہترین وضاحت ذیل کے دو عنوانوں کے تحت کی جاسکتی ہے۔

۱۔ یقین و تاریخ کا باہمی فصل

۲۔ تاریخی ترقی کا زوال

اسلام نے دنیا کے آگے بعض ایسی عالمگیر قدریں پیش کیں جن پر اس کے متبعین پورا پورا یقین رکھتے تھے اور مسلم معاشرہ دراصل اپنے افراد و ارکان کے اسی یقین کا ماحصل تھا۔ اور اسی یقین نے فرد کی ان سرگرمیوں کا مرکز مہیا کیا جن سے ایک اجتماعی زندگی اور ایک رفعت پذیر اور مدنی معاشرہ کا ڈھانچہ تیار ہوا۔ مسلم تاریخ کیا ہے؟ زمان و مکان میں یقین کی عمل آوری۔ عہد نبویؐ اور دور خلفائے راشدین کے مسلمانوں نے ایک سیاسی تنظیم، ایک معاشرتی ڈھانچہ اور ایک ایسا معاشی نظام تشکیل دیا جو ان کے یقین کے عین مطابق تھا۔ یہ لوگ اپنے یقین کے مطابق ہی عمل کیا کرتے تھے۔ اس طرح یقین و تاریخ کے مابین ایک مطابقت تھی، اتحاد تھا، ہم آہنگی تھی، ایک وصل تھا جو فصل سے ناآشنا تھا۔

لیکن بعض وجوہ کی بناء پر جن کی تفصیل میں جانے کا یہاں کوئی موقع نہیں ہے، یقین و تاریخ کا یہ مضبوط رشتہ ٹوٹ گیا۔ باوجود اس کے کہ علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کی ہر اقلیم کو مسلمان سرگرم رہے تھے۔ اور ہر میدان میں پرچم قیادت اڑا رہے تھے۔ زمانہ کی آنکھیں یہ بھی صاف طور

پر دیکھ رہی تھیں کہ یہ لوگ اپنے اساسی تصور سے دور ہوتے چلے جا رہے تھے[1]۔ چنانچہ اس کا ثبوت ہمیں موروثی بادشاہت کے رواج اور تصوّف کے غلبہ سے ملتا ہے۔ تصوّف اس نظریہ کا مؤید ہے کہ مذہب فرد کا ایک نجی معاملہ ہے اور اس کا تعلق تاریخی فتوحات و حاصلات سے کہیں زیادہ تزکیۂ نفس اور نجاتِ اخروی سے ہے۔

یقین و تاریخ کا یہ فصل جو شروع میں نہایت خفیف اور غیر محسوس سا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یقین و تاریخ کی اس درمیانی خلیج کو پاٹنے کی کوششیں بھی کی گئیں لیکن ان میں جو کامیابیاں ہوئیں وہ محض جزوی اور موقتی تھیں اور اٹھارویں صدی کے اواخر میں یہ خلیج اتنی وسیع ہوگئی کہ اس کا پاٹنا بعید از امکان نظر آنے لگا۔

اگرچہ مسلم تاریخ یقین کے مرکزی نظریہ سے دور جا پڑی تھی لیکن وہ ایک عرصہ تک اوج کی طرف حرکت کرتی رہی۔ انشذاذی رجحانات اور سلاطینی رقابتوں کے باوجود زمانہ مابعد کے معاشرتی سیاسی، اور معاشی اداروں نے عوام کو امن و خوش حالی کی ضمانت دے رکھی تھی، لیکن یقین کی شاہراہ سے انحراف کرنے کا اثر مسلمانوں کی دنیاوی تاریخ پر پڑنا ازبس ضروری تھا۔ وہی مسلم معاشرہ جو کبھی تہذیب و ثقافت کی ہر شاہراہ پر امامت و قیادت کا لوائے احتشام اڑائے جا رہا تھا۔ اب بڑی تیزی کیساتھ زوال کی پستیوں میں گرنے لگا۔ خلافت جس نے کبھی منتشر و پراگندہ عناصر کو ایک ہم آہنگ وحدت کی لڑی میں پرو دیا تھا، زمانہ نے اسے اس قدر خراب و خستہ کر دیا کہ وہ چھوٹی چھوٹی شاہیوں اور سلطانیوں کا ایک بے ڈھب سا ڈھیر بن کر رہ گئی اور کچھ زیادہ مدّت گذرنے نہ پائی کہ یہی شاہیاں اور سلطانیاں ایسی ایسی برائیوں اور خباثتوں کی پرورش گاہوں کی صورت اختیار کر گئیں جو ایک زوال پذیر معاشرہ سے مختص ہوا کرتی ہیں، وہ معاشی نظام جسے اسلام نے اس لئے وضع کیا تھا کہ اسکی معرفت ساری امت کے لئے مساوی مواقع میسّر ہوں اور دولت صرف چند ہاتھوں میں سمٹنے سے محفوظ رہے، اس کا زریں پیرہن جگہ جگہ سے چاک ہوگیا اور اسکی دھجیوں سے جاگیرداریت جیسی عدم مساواتوں کی قبائیں بنائی گئیں۔ علوم و فنون اور تجارت و حرفت کی راہیں بری طرح مسدود ہوگئیں۔ وہ دین جو توحید خالص کی تعلیم دیتا تھا، اب اس کا چشمۂ صافی غیر اسلامی اور غلط عناصر کی آمیزش سے گدلا ہوگیا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ مسلم معاشرہ ایسی ایسی اعلیٰ قدروں کی جنّت بنا ہوا تھا جو اس سے قبل بنی نوع انسان کو کبھی نصیب ہی نہ ہوئی تھیں، لیکن اب وہ وقت جا چکا تھا اور وہ زمانہ معدوم ہو چکا تھا۔

اسلامی تصوّر اور مسلم آئین ہر دو کے زوال نے مسلمانوں کو ایسی زندگی کی طرف دھکیل دیا تھا،

---

[1] مقالہ نگار کے بعض دیگر آراء کیطرح صحیح اسلامی تصوّف کے بارے میں ان کی اس رائے سے بھی ہمیں اختلاف ہے۔ (ادارہ)

جو خلل و انتشار سے پُر تھی۔ ملک کے اندر سیاسی عدم استحکام نے، بیرونی دنیا سے نمٹنے کی عدم صلاحیت نے معاشی نظام کی ابتری و خستہ حالی نے، تجارت و حرفت کی قیادت کے نقصان نے، ایک زوال پذیر ثقافت کے بوجھل رسومات نے غرض یہ اور اس قسم کے دیگر عناصر نے ملکہ مسلم معاشرہ پر ایسا انتشار ڈالا جو اس کے لئے قطعاً ناقابل برداشت تھا۔ اٹھارویں صدی میں مسلم معاشرہ کو جو مسئلہ درپیش تھا وہ یہ تھا کہ انتشار و پراگندگی اور زوال و پستی کیطرف لے جانے والی قوتوں کو دبایا جائے اور اسلام کے اقداری ڈھانچہ کی تماماً و کمالاً جدید تنظیم کی جائے۔

یہ تھا وہ زمانہ اور یہ تھے وہ حالات جبکہ حضرت شاہ ولی اللہ ایک ایسے ہندوستانی گھرانہ میں پیدا ہوئے تھے جو اپنے علم و تقویٰ کے لئے دور دور تک مشہور تھا۔ شاہ صاحب کو ابتدائی تعلیم مدرسہ رحیمیہ میں ملی تھی۔ اس مدرسہ کو ان کے والد شاہ عبدالرحیم نے قائم کیا تھا، جو خود بھی ایک تبحر عالم اور ممتاز صوفی تھے اور فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں ان کا بھی حصّہ تھا۔ مدرسہ رحیمیہ کو اپنے عام تعلیمی اداروں میں بے نظیر حیثیت حاصل تھی۔ اس دار العلوم کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ س نے ایک طرف متکلموں اور صوفیوں اور دوسری طرف فقیہوں کے انتہاپسندانہ خیالات کے مابین ایک واسطہ تلاش کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ اس ادارہ کا ماحول اعتدال پسندانہ تھا، یہاں کے اساتذہ استدراک مسائل کے معاملہ میں امتزاجی طریق کار پر کاربند تھے اور ان کے اس طریق استدراک نے شاہ ولی اللہ کے لوح ذہن پر کچھ اتنا گہرا اور پائیدار نقش بٹھایا کہ وہ مدت العمر باقی رہا۔

عہد طفولیت ہی سے شاہ ولی اللہ میں تعمیری تفکر کی علامتیں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ پندرہ سال کی چھوٹی سی عمر ہی میں انہوں نے قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر علوم اسلامیہ کی تعلیم مکمل کر لی تھی، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں انہیں شیخ ابوطاہر جیسے عظیم المرتبت اساتذہ کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کے مواقع ملے تھے جو "اپنی آزادی رائے[1] اور ملائمت کلام" میں بڑے مشہور تھے۔

شاہ ولی اللہ ۱۷۳۲ء میں ہندوستان آئے اور یہاں انہوں نے ایسے مضامین کے درس دینے اور ان پر کتابیں قلمبند کرنے کا کام شروع کیا جن پر زمانہ کی توجہ خصوصیت کے ساتھ مرکوز تھی۔

ان کی تصانیف کی طویل فہرست میں حسب ذیل کتابیں بے انتہا قدر و منزلت کی حامل ہیں۔

۱۔ بدور بازغہ ۲۔ ازالۃ الخفا ۳۔ فیصلہ وحدت الوجود و وحدت الشہود۔
۴۔ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف ۵۔ حجۃ اللہ البالغہ۔

موخر الذکر کتاب اسلامی فکر و معتقدات کی گویا قاموس ہے۔ شاہ صاحب کی ان تمام تصنیفوں

---

[1] یہ آزادی رائے آج کل کے روشن خیالوں جیسی نہ تھی ۔۔۔ س ح۔

میں مذہبی تصورات کی تعمیر جدید اور مسلمانوں کی زندگی میں روح حرکت کے نفوذ کے موضوع کو آپ ہر جگہ حاضر و موجود پائیں گے۔ یہاں ہم اسلام میں مذہبی فکر کی تعمیر جدید اور مدنی معاشرہ کی تنظیم نو کے متعلق شاہ ولی اللہ کے خیالات و نظریات کا خلاصہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ ہم سطور بالا میں بیان کر چکے ہیں اٹھارویں صدی کا مسلم معاشرہ انحرافیت اور زوال کی قوتوں کا شکار بن چکا تھا۔ ایک خطرناک قسم کا انتشار مسلمانوں کی زندگی کو زنگ کی طرح چاٹ رہا تھا۔ یہ انتشار سطحی نہ تھا۔ بلکہ اس سے تو اسلام کے اقداری ڈھانچہ کو شدید ضرب پہنچ چکی تھی۔ لہذا وقت کی اہم ترین ضرورت یہ تھی کہ اسلام کے مذہبی تصورات کی جدید تعمیر کی جائے۔

شاہ ولی اللہ جو مسئلہ کی اہمیت کا نہایت گہرا احساس رکھتے تھے۔ اس میدان میں اپنی مساعی جمیلہ کے ساتھ اتر آئے۔ سب سے پہلے انہوں نے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس حالت تذبذب و انتشار کے سبب سے بڑے وجوہ دو ہیں۔ ۱۔ غیر اسلامی خیالات کا نفوذ۔ ۲۔ عہد وسطیٰ کے مستندات کے ساتھ مطابقت کا لزوم۔ اول الذکر سے مسلمانوں کے معتقدات بری طرح ملوث ہو گئے تھے اور موخر الذکر کے ہاتھوں مسلمانوں کی قومی زندگی جامد اور معطل بن کر رہ گئی تھی۔

قرآن و حدیث ہی دو ایسے ستون تھے جن پر مسلم معاشرہ کی پوری عمارت قائم تھی اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا، صوفیوں اور نظریہ بازوں کے خود ساختہ نظریئے قرآن و حدیث کی تعلیمات کو اپنے سیلاب بے تمیزی میں غرق کرتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے سواد اعظم میں غیر صحت مند تخیلات کی ایک آماجگاہ تیار ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ شاہ ولی اللہ نے "قرآن و حدیث کی طرف لوٹ جاؤ" کا ولولہ انگیز نعرہ بلند کیا وہ یہ سمجھتے تھے کہ قرآنی طرز زندگی کو بحال کرنا اور رواجی طریق زندگی کی حدوں کے پار گذر جانا ہی مسلم قوم کے مسئلہ کا واحد حل ہے۔ ان کے پاس قرآنی طرز زندگی کا مطلب یہ نہ تھا کہ عہد نبوی ؐ کے مروجہ شعار و آداب کی من و عن تقلید کی جائے بلکہ وہ تو عالمی اور مقامی امور و معاملات میں نمایاں امتیاز قائم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب ایک روح ہے جو کسی خلا میں ظاہر نہیں کی جا سکتی بلکہ اس کے لئے تو ایک ذریعہ کی ضرورت ہوتی ہے اور مذہب اسلام کی یہ ضرورت عربی روایات سے پوری ہوتی ہے۔ زمان و مکان کے تبدل و تغیر کے ساتھ ساتھ مذہب کا ذریعۂ اظہار بھی بدلتا جاتا ہے۔ لیکن وہ ذریعہ جس میں اسلام کو سب سے پہلی دفعہ اپنے تئیں ظاہر کرنے کا موقع ملا وہی تمام ذریعوں کے مقابلہ میں نہایت عمدہ

اور بہترین ہے، اس لئے لازم ہے کہ اسی ذریعہ کو مقامی عمل آوریوں اور پابجائیوں کے جانچنے کا معیار بنایا جائے۔

شاہ ولی اللہ کا طریق استدراک عمرانیاتی تھا۔ وہ نعقید المثال بصیرت کے عالم تھے' وہ سمجھتے تھے کہ مختلف ثقافتیں بجائے خود الگ الگ حقیقتیں ہیں جو ہمیشہ سے ہیں۔ اور ہمیشہ رہیں گی۔ چنانچہ وہ اپنے اسی نظریہ کے تحت ثقافتی اضافتوں کو جائز قرار دیتے تھے اور مدار اسلام کے اندر ثقافتی کثرتیت کے تصوّر کی وکالت کرتے تھے۔

اٹھارویں صدی کے لگ بھگ مسلمانوں میں زندگی کا ایک سکونی نظریہ فروغ پا گیا تھا جو اس عقیدہ پر منتج ہوا کہ وقت کے چیلنج کا جواب دینے کے لئے ایک عام فکری اصول ہی کافی ہے۔ مگر شاہ ولی اللہ تو ان ممتاز ترین مفکروں میں سے تھے جنہوں نے زندگی کی حرکی خصوصیت پر نہ صرف دوبارہ توجہ دی بلکہ بڑے شد و مد کے ساتھ اس کا پرچار بھی کرتے رہے۔ شاہ صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زندگی ہر لحظہ متغیّر ہوتی رہتی ہے اور ہر تغیّر ایک نئی جدّت کا موجب ہوتا ہے۔ اس لئے وجود کے ہر لحظہ متغیّر ہونے والے پہلو کا مقابلہ کرنا کسی عام فکری اصول کے بس کا روگ نہیں ہے۔ لہٰذا صحت مند اور کارکرد فکری اصول صرف وہی ہو سکتا ہے جو نہ صرف ایسی مستقل قدروں کا سرمایہ دار ہو جو معاشرہ کے لئے مستقل سہارا مہیا کرتی ہیں، بلکہ اس میں معاشرہ کو بدلتے ہوئے حالات سے متوافق بنانے کی صلاحیت بھی موجود ہو۔ اور اسلام میں یہ صلاحیت اصول اجتہاد کی صورت میں موجود ہے۔

شاہ ولی اللہ نے اصول اجتہاد کو بڑی محنت و جانفشانی سے اتمام تک پہنچایا اور اسکو زندگی کے مختلف احوال پر منطبق کرنے کے ضوابط بھی وضع کئے۔ انہوں نے اصول اجتہاد کو جو اس قدر زیادہ اہمیت دی ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ اس اصول کی عمل آوری ہر زمانہ میں لازمی قرار پا جائے۔

متقدم مفکرین روحانی اور اخلاقی عوامل ہی کو معاشرہ کے تغیّر و تبدّل کا ذمہ دار گردانتے تھے اسی لئے وہ ان عوامل کو بے حد اہمیت دیتے تھے، اور اس کے برخلاف مادی قوتوں کی ان کے پاس کوئی اہمیت نہ تھی۔ لیکن شاہ ولی اللہ یہ سمجھتے تھے کہ معاشری ڈھانچہ میں رونما ہونے والے تغیرات کے اپنے جداگانہ قوانین ہیں جو انسانی شعور کے باہر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ یہ قوانین روحانی اور مادی دونوں قسم کے ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب نے مادی قوتوں پر زیادہ زور

دیا ہے۔ انہوں نے معاشی عوامل کو معاشرتی ڈھانچہ کی صورت گری ہیں اتنی اہمیت دی کہ روحانی اور اخلاقی قدروں کو معاشی معدلت و انصاف کا تابع بنا دیا۔ شاہ صاحب نے "ارتفاق" اور "اقتراب" کی دو اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ اوّل الذکر اصطلاح عمرانیاتی معاشی تحفظ کے لئے ہے اور موخر الذکر روحانی ارتقاء پر دلالت کرتی ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک روحانی ارتقاء زندگی کا اہم ترین مقصد ہے لیکن تاوقتیکہ لوگوں کی دنیاوی زندگی میں عمرانیاتی معاشی تحفظ موجود نہ ہو مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کی بدنظمیوں کے اسباب و علل پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "ان دنوں ریاست پر جو تباہی نازل ہو رہی ہے اس کے دو سبب ہیں۔ پہلا سبب تو سرکاری خزانہ کی زیر باری ہے جسکی حقیقت یہ ہے کہ لوگوں میں کوئی خدمت یا کام انجام دئے بغیر سرکاری خزانہ سے مفت رقم حاصل کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اس کے لئے یا تو وہ اپنے سپاہی یا عالم ہونے کا عذر پیش کرتے ہیں۔ اور اس جہت سے خزانہ پر اپنا حق جتلاتے ہیں۔ یا اپنے تئیں ان لوگوں میں شامل کرتے ہیں جنہیں خود بادشاہ انعام واکرام پیش کرتا ہے۔ یعنی صوفیان با صفا اور شعرائے نغز گو یا اسی قبیل کی دیگر جماعتیں جو ریاست کی کوئی خدمت بجا لائے بغیر سرکاری خزانہ سے مشاہرے پاتی رہتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی آمدنی کے وسائل گھٹا دیتے ہیں اور ملک کی معیشت پر ایک بوجھ بنے ہوئے ہیں۔

اس عام تاراجی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ مزارعین، تجار اور اہل حرفہ سے بھاری محاصل وصول کئے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ تمام جماعتیں جو ریاست کی وفادار اور فرمانبردار ہیں رفتہ رفتہ خستہ حال اور پامال ہوتی جا رہی ہیں۔ سرکش اور عیار روز افزوں سرکش و عیار بنتے جا رہے ہیں۔ وہ کوئی محصول ادا نہیں کرتے۔ کسی ملک کی خوشحالی اور اقبال مندی کا مدار اس پر ہے کہ عوام پر محاصل کا بوجھ کم سے کم ڈالا جائے اور فوج نیز دیگر محکمہ جات میں صرف اتنے ہی آدمی ملازم رکھے جائیں جتنوں کی واقعی ضرورت ہو۔ لوگوں کو چاہیئے کہ اس رمز کو اچھی طرح سمجھ لیں۔"

شاہ ولی اللہ نے اصول "عدل" و "توازن" پر زور دیا ہے۔ عدل سے ان کی مراد عام اصول معدلت و انصاف سے ہے اور توازن سے ان کی مراد معاشی تعلقات میں تعادل و مساوات سے ہے۔ ایک اور عامل جس کو شاہ صاحب بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ تمدنی شعور ہے جس کا انحصار زیادہ تر خاندان کے صحت مندانہ نشو و فروغ پر ہوتا ہے۔ شاہ صاحب

کہتے ہیں کہ تاوقتیکہ یہ تینوں عوامل بہ یک وقت عمل پیرا نہ ہوں کوئی معاشرہ صحت مندانہ طریقہ سے فروغ نہیں پا سکتا اور جو معاشرہ ان چیزوں سے محروم ہوتا ہے وہ ضرور فنا ہو جاتا ہے۔

جس زمانہ میں شاہ ولی اللہ نے اپنی تحریک آغاز کی اس وقت ہندوستان دوہری آفت سے دوچار تھا یعنی یوروپی طاقتوں کی مداخلت اور اندرونی قوتوں کی دہشت گردی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندے پہلے ہی سے مغل سلطنت کے کئی صوبوں پر چھا چکے تھے۔ سکھ، مرہٹے اور جاٹ تخت دہلی کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ ملک کی زبوں حالی کا یہ نقشہ دیکھ کر شاہ صاحب نے سب سے پہلا کام یہ کرنا چاہا کہ مغل سلطنت کو مکمل طور پر منہدم ہونے سے بچایا جائے۔ لیکن یاد رہے کہ اس سے مقصود آل تیمور کی عزت و ناموس کا تحفظ کرنا نہیں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کو مغل سلطنت کی بقا و استحکام میں اپنے مستقبل کے لائحہ عمل یعنی خلافت راشدہ کے نمونہ پر مسلم معاشرہ کی تنظیم جدید کرنے کے لئے ایک مضبوط اساس نظر آتی تھی۔

شاہ صاحب نے ایک طبیب حاذق کی طرح مغل سلطنت کے مرض کی تشخیص کی اور اس کے علاج کے سلسلہ میں مغل بادشاہ کو حسب ذیل مشورے دئیے:

۱۔ جاٹوں کی شورش سکھوں اور مرہٹوں کی شورشوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خطرناک ہے کیونکہ یہ لوگ خاص پایۂ تخت سے بہت قریب ہیں۔ لہذا ان کی روک تھام کے لئے موثر اقدامات کئے جائیں۔

۲۔ جو علاقہ راست مرکزی نظم و نسق کے تحت ہے اس کو اکبر آباد اور سرہند تک وسعت دیدی جائے۔ اس سے سرکاری خزانہ کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔ کیونکہ مرکزی اقتدار کو جو زوال آرہا ہے اس کا سب سے بڑا سبب خزانہ کی زبوں حالی ہے۔

۳۔ چھوٹی چھوٹی جاگیروں کو باہم جوڑ کر بڑے صوبے بنا دئیے جائیں اور ان پر ایسے حاکم مقرر کئے جائیں جن کی وفاداری آزمودہ ہو۔

۴۔ فوج کی از سر نو تنظیم کی جائے اور کلیدی عہدوں پر صرف عمدہ صلاحیتوں کے آدمیوں کو مامور کیا جائے۔ مشاہرات کی ادائیگی میں پابندی اور باضابطگی کا خاص لحاظ رکھا جائے کیونکہ سپاہی وقت پر تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بددیانت اور بداطوار اور مآل کار تباہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

۵۔ قاضیوں اور محتسبوں کو مامور کرتے وقت اس بات کا پورا پورا اطمینان کر لیا جائے کہ وہ لوگ جنہیں یہ عہدے دیئے جا رہے ہیں اتنے بلند کردار ہیں کہ خوف یا طرفداری ان کے پائے ثبات کو متزلزل نہیں کر سکتی۔

شاہ صاحب نے یہ بھی مشورہ دیا کہ ائمہ مساجد کو باقاعدہ تنخواہیں دی جائیں

مغل بادشاہ کو حالات وقت کے مقابلہ پر کمربستہ کرانے میں جو کوششیں شاہ صاحب نے کی تھیں وہ سب کی سب رائیگاں گئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حکومت کی تنظیم جدید کی مہم بادشاہ کے بس کا روگ نہ تھی۔ مغل بادشاہ سے مایوس ہو کر شاہ صاحب نے نظام الملک کی طرف نظریں اٹھائیں۔ لیکن نظام الملک دکن کے معاملات میں کچھ اس درجہ منہمک تھے کہ شمال کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہ لے سکے۔ تب شاہ صاحب نے روہیلوں کے سردار نجیب الدولہ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اسے معاشرہ کو مزید انتشار و پراگندگی کی مصیبتوں سے بچانے پر آمادہ کر لیا۔ اگرچہ نجیب الدولہ نے اس مہم کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ لیکن بہت جلد اس کے امیروں اور لشکر کے سرداروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ناچار شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی اور ان کی یہی دعوت پانی پت کی تیسری لڑائی پر منتج ہوئی۔ ابدالی کے ہاتھوں مرہٹوں نے جو شکست کھائی تھی اس سے ان کی ساری طاقت کچل کر رہ گئی اور تخت دہلی کو حاصل کرنے کی جو آس ان کے دلوں میں موجزن رہتی تھی وہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نراس بن گئی۔

اس واقعہ کے بعد شاہ صاحب اپنے سیاسی لائحہ عمل کو جاری رکھنے کے لئے کچھ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے کیونکہ ۱۷۶۲ء میں وہ اپنے رب سے جا ملے۔

امام شاہ ولی اللہ ایک جید عالم، باکمال صوفی، غیر معمولی ذہین مصلح اور ایک نہایت ہی بلند پایہ معاشری مفکر گذرے ہیں۔ علوم اسلامیہ سے جو وقوف انہیں حاصل تھا اس میں ایک قاموسی شان جھلکتی ہے۔ ان کے قلم نے اسلامی علم کی تقریباً تمام شاخوں پر اپنا اثر چھوڑا ہے اور یہ اثر صرف اندرون ہند سمٹا نہیں رہا بلکہ ہندوستان کی سرحدوں کے پار بھی جا پہنچا تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ شاہ صاحب کا ادبی شاہکار ہے۔ یہ کتاب آج بھی الازہر اور سوڈان میں درسی کتاب کی طرح پڑھائی جاتی ہے۔

اسلامی تاریخ نے یوں تو ایسی بیشمار شخصیتیں پیدا کی ہیں جنہیں بعض انفرادی اوصاف میں بڑی فضیلت حاصل تھی، لیکن ایسی شخصیتیں خال خال ملیں گی جو شاہ ولی اللہ کی طرح مجموعۂ کمالات گذری ہیں۔ شاہ صاحب نے مختلف مضامین و مباحث پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

خیالات عدم توازن اور بے جا طرفداری کی قباحتوں سے منزہ ہیں۔ شاہ صاحب کا طریق استدراک عقلی اور عمرانیاتی ہے۔ لیکن صرف ایک خلافت کا معاملہ ہی ایسا ہے، جس میں وہ اپنے اصل اصول سے انحراف کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے خلافت کو ظاہری اور باطنی دو شقوں میں منقسم کیا ہے۔ اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ تو ایک ایسی وحدت ہے جس کا دامن اس قبیل کی ثنویت سے یکسر پاک ہے۔ خلافت کی اس تفریق کے عقیدہ کی رو ہمیں منطقی طور پر ایسے متعدد خیالات کی طرف بہائے جاتی ہے۔ جو اسلام کے بالکل مغائر ہیں۔

شاہ ولی اللہ کا سب سے عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے معاشرہ میں بدلی ہوئی اور بدلتی ہوئی دنیا کے تعلق سے ازسر نو جان ڈالنے کا ایک مکمل پروگرام پیش کیا۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی بہت ہی کم کوششوں کو مثمر و بار آور ہوتے دیکھ سکے۔ لیکن اس سے ان کی عظمت اور بڑائی کا حق محدود نہیں ہو جاتا۔ ان کی عظمت تو صحیح معنی میں اس گراں القدر میراث میں مضمر ہے جو انہوں نے آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑی تھی۔ شیعوں اور سنیوں کے متصادم خیالات کو مربوط، راسخ الاعتقادیوں اور صوفیوں اور خود صوفیوں کے باہمی اختلاف کو رفع اور مسلم زندگی کیلئے ایک نیا منہج تلاش کرنے کے سلسلہ میں جو کوششیں شاہ صاحب کی جانب سے ہوئی ہیں وہ سب کی سب نہایت ہی دوررس نتائج کی حامل نکلیں۔

شاہ ولی اللہ کے عمرانیاتی معاشی پروگرام کو ان کے نامور فرزندوں اور پرجوش مریدوں نے مبینہ وہابی تحریک کی صورت میں جاری رکھا۔ شاہ عبدالعزیز کا برطانوی مقبوضہ ہند کو دارالحرب قرار دینے کا فتویٰ، سید احمد سرہندی کی تحریک جہاد اور دیوبند و علی گڑھ کی تعلیمی تحریکیں یہ سب کے سب اور تمام کے تمام بالواسطہ اور بلاواسطہ نتائج ہیں۔ ان قوتوں کے جنہیں اس فلسفی درویش نے لذت حرکت سے آشنا کیا تھا۔ اس برصغیر کے موجودہ مسلمانوں کا کوئی خیال یا کوئی تحریک بھی آپ ایسی نہیں پائیں گے جس پر شاہ ولی اللہ کے خیال کا اثر یا ان کی تحریک کا نقش ثبت نہ ہو۔

ممتاز علمی و دینی مجلہ
ماہنامہ
البلاغ

ادارت: مولانا محمد تقی عثمانی
پاکیزہ اور مفید دینی معلومات۔ علمی مضامین کے لئے مطالعہ فرمائیے۔
زرسالانہ ۸/- روپے، فی پرچہ ۷۵ پیسے
البلاغ۔ دارالعلوم کراچی ۱۴